

آراء و افکار

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی *

سید ابوالحسن علی ندویؒ: فکری امتیازات و خصائص

انیسویں صدی کے اواخر میں عالم اسلام سیاسی، عسکری اور علمی و فکری زوال کی انتہا کو پہنچ رہا تھا اور بیسویں صدی کے آغاز تک مغربی استعمار عالم اسلام کے حصے بچنے کرنے اور خلافت کے ادارہ کو توڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس ناگفتہ بہ صورت حال نے عالم اسلام میں بے چینی کی ایک لہر دوڑادی اور ہر طرف علمائے راسخین اور مجاہدین آزادی اٹھ کھڑے ہوئے۔ مختلف اسلامی تحریکات اور شخصیات دنیا کے اسلام کے کونے کونے میں پان اسلام ازم اور احیائے اسلام کے مبارک و مقدس کاز کے لیے سرگرم عمل ہو گئیں۔

یہ زمانہ افکار و نظریات کی شکست و ریخت کا زمانہ تھا۔ مغرب کے صنعتی و سائنسی انقلاب نے وہاں کے حالات یکسر بدل دیے تھے۔ افکار و خیالات کی دنیا میں ایک نمایاں تغیر آچکا تھا، اب جاگیرداری ختم ہو رہی تھی اور اس کی جگہ شراکت جمہور نے لے لی تھی۔ سرمایہ داری کی پرانی شکلیں تبدیل ہو کر اب بین الاقوامی تجارتی ادارے (M.N.C.S) قائم ہو رہے تھے۔ موروثی بادشاہت اور آمریت کی طنائیں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے یکے بعد دیگرے ٹوٹ رہی تھیں۔ مزدوروں کے استحصال نے سرمایہ دارانہ نظام اور بورژوا طبقہ کے خلاف سخت معاندانہ رجحانات پیدا کر دیے تھے۔ انفرادی ملکیت کی بجائے اب سیاست و معیشت کے اداروں میں پروتاریہ خیالات کی گونج سنائی دے رہی تھی اور یہ فکر زندگی کے ہر شعبہ کو شدت سے متاثر کرنے لگا تھا۔

مغربی نشاۃ ثانیہ کی پرورش و پرداخت اصلاً یہودی دماغ نے کی تھی، چنانچہ الحاد، بے دینی اور اخلاق سے بیزاری اس نئی تہذیب اور نئی بیداری کی نمایاں علامتیں بن گئیں۔ اب عقل انسانی ہی ہر چیز کی میزان، اور افادیت و نفع بخش ہی تمام اعمال کے خیر و شر ہونے کا پیمانہ بن گئے۔ مذہبیات اور روحانیت پر الحاد و تشکیل کی ہوائیں چلنے لگیں اور نئی نسلوں کے اذہان و قلوب کو متاثر کرنے لگیں۔ قومیت اور نیشنل ازم کی آوازیں اس زور سے اٹھیں کہ وطن پرستی ہی ”روح عصر“ سمجھی جانے لگی۔ عالم اسلام خود مختلف عصبیتوں اور قومیتوں کا شکار ہو گیا۔ فکری زعامت اور علمی و تحقیقی امامت بھی مشرق سے چھن کر اب مغرب کو منتقل ہو چکی تھی۔ عالم اسلام پر اب عسکری و سیاسی حملوں کے بجائے علمی و فکری یلغاریں زیادہ ہو رہی تھیں اور حکومت و ریاست اور سیاست و معیشت کے مختلف اور متعدد نظریات سامنے آ رہے تھے۔

ایسی صورت حال میں عالم اسلام میں اٹھنے والی مختلف تحریکات اور ان کے فکری رہنماؤں کی تحریروں اور تعبیروں میں

* ڈاکٹر فائز ٹنڈیشین فاراسلاک اسٹڈیز جامعہ، نگر نئی دہلی۔ ghitreef1@yahoo.com

_____ ماہنامہ الشریعہ (۶) اپریل ۲۰۱۰ _____

خارج کے دباؤ کے تحت کچھ افراط و تفریط کا آ جانا کچھ زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے، کیونکہ انسان ہر حال میں اپنے ماحول اور ارد گرد کی فضا سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ برصغیر میں مدرسہ مودودی کے پیدا کردہ لٹریچر اور اس کے بانی کی خاص مصطلحات میں اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح عالم عرب میں عظیم اسلامی تحریک ”الاخوان المسلمون“ کے ایک بڑے فکری رہنما اور مجاہد سید قطبؒ شہید کی بعض تحریروں میں بھی انہیں خیالات کی بازگشت ملتی ہے۔ برصغیر کی بعض دوسری اور تحریکوں میں بھی افراط و تفریط کی یہی صورت حال نظر آتی ہے۔ ان میں سے بعض مغربی انقلاب سے شدید طور پر متاثر تھیں اور بعض خالص صوفیانہ نقشہ کے ساتھ اصلاح کا کام کرنا چاہتی تھیں۔ ۳

تحریکی و انقلابی تصور دین کی علمبردار جماعتوں اور تحریکوں نے بلاشبہ دین کی مدافعت و نصرت کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے کئی نسل کو الحاد و تکلیک کے حملوں سے بچایا، مستشرقین اور متجددین کے اعتراضات کے جواب دیے، اسلام سے متعلق مختلف پہلوؤں پر عصری اسلوب و آہنگ میں لٹریچر فراہم کیا۔ بایں ہمہ چونکہ ان میں سے بیشتر اسلامی تحریکات کا پہلا دور جوش و خروش اور انقلابی جزئیات اور تبدیلی کے ایک عمومی نشانہ کو لے کر ہوا تھا، اس بڑھی ہوئی انقلابیت کی وجہ سے کہیں پر جا رہے مستند مسلمان حکمرانوں سے ٹکراؤ اور تصادم کی کیفیت پیدا ہو گئی اور کہیں پر بنیادی فکر اور لٹریچر میں دین کی تعبیر و تشریح کے سلسلہ میں افراط و تفریط نے راستہ پالیا، حتیٰ کہ جو شیعہ نوجوان کارکن اور نسبتاً زیادہ انقلابی افراد ان تحریکوں سے بھی مایوس ہو کر الگ الگ گروپ بنانے میں جٹ گئے اور نیا خون کم ملنے کی وجہ سے اب اکثر تحریکیں تعصب و تحزب اور جمود فکری کا شکار ہونے لگی ہیں۔

دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں محکم ”خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی“ امت مسلمہ کی ۱۴ سو سالہ تاریخ و اوبار، انحطاط و تنزل کے ساتھ ہی اصلاح و تجدید سے بھی معمور رہی ہے۔ امت کی اس پوری تاریخ میں عام روایت یہ رہی ہے کہ مصلحین و مجددین بلا استثنا پوری قوم کو اپنا مخاطب بناتے تھے۔ انھوں نے کسی تحریک و تنظیم کے تصور کی اساس پر کام نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاح و تجدید کی تاریخ میں عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سے لے کر حسن بصریؒ، عبدالقادر جیلانیؒ، غزالیؒ و اشعریؒ تک اور ابن تیمیہؒ و ابن غلدونؒ سے لے کر امام ربانیؒ و مجدد الف ثانیؒ سرہندیؒ اور امام ولی اللہ محدث دہلویؒ تک سب کے سب امت کی مشترکہ میراث بن گئے اور آنے والی نسلوں نے ان سے بلا استثنا کسب فیض کیا۔ ان عبقری شخصیات نے فقہی، جمود، مسلکی اور جماعتی تعصب کی تنگ نایوں اور محدودیتوں سے نکل کر فکر اسلامی کے آفاقی اور وسیع تصور کو سامنے رکھا۔

بیسویں صدی میں اٹھنے والی انقلابی تحریکیں امت میں ایک نئی روایت کا آغاز تھیں۔ ان سے امت کی اصلاح و تجدید کا یہی نکتہ پوشیدہ رہ گیا۔ بطور خاص برصغیر میں دین کی تعبیر کے لیے جو اسلوب اختیار کیا گیا، جوں و لہجہ اپنایا گیا، وہ یہاں کے لیے ایک نئی اور نامانوس بات تھی۔ اس کے باعث، نیز یہاں کے مخصوص حالات کے پیش نظر علما کی بڑی تعداد اس تحریک سے دور و نفور ہی رہی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک مخصوص فکری حلقہ پیدا کرنے کے علاوہ یہ تحریکیں کوئی ہمہ گیر شکل اختیار نہ کر سکیں۔ عوام قابل ذکر تعداد میں ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور ساری صلاحیتوں اور امکانات کے باوجود ان کے اثرات عام طور پر بہت محدود ہو کر رہ گئے۔

مذکورہ تحریکات کی نشو و نما اور ارتقا کا زمانہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے عنفوان شباب کا زمانہ ہے۔ مولانا نے ان میں سے بیشتر تحریکات اور ان کے بانیوں کو دیکھا، پرکھا اور برتا تھا۔ کئی ایک سے ان کی عملی وابستگی بھی رہی اپنے فکری سفر کے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے بالآخر وہ خود ”ایک شخص ایک کاروان“ کی شکل اختیار کر گئے۔ گزشتہ نصف صدی کی عظیم

علمی و فکری شخصیات کے مابین مولانا تنہا ایک ایسے داعی و مفکر اور روحانی قائد اور مرشد امت ہیں جو ان ساری محدودیتوں سے نکل کر بذات خود ایک مدرسہ فکری حیثیت اختیار کر گئے۔ مولانا ندویؒ کی زندگی، ان کی عقلیت کے تکوینی عناصر، ان کا خاندانی پس منظر، ان کے اساتذہ گرامی قدر، ان کی تعلیم و تربیت اور فکری نشوونما، ان کی تصنیفات، ان کے عملی کارناموں اور ان کی اصلاحی و دعوتی جدوجہد کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے، بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور آئندہ بھی ان پہلوؤں پر بہت سا کام ہوگا۔ میں یہاں اختصار کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا کا فکری خمیر تحریک شہیدین کی جامع روح پرور اور انقلابی تجدیدی دعوت سے اٹھا تھا۔ یہی تحریک تھی جو ان کے دل میں جا گزری ہوئی تھی اور کہا جاسکتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد وہ اسی تحریک کو مثالی اور آئیڈیل نمونہ تصور کرتے تھے، اور اسی کے عملی مظاہر اور تقاضوں کی تلاش و جستجو میں انھوں نے مختلف شخصیات اور مختلف مراکز دعوت و فکری طرف قدم بڑھائے تھے۔ سید مودودیؒ سے ان کا فکری رشتہ اسی کی خاطر استوار ہوا تھا۔ بستی نظام الدین کے مرکز تبلیغ کی طرف ان کے قدم تبلیغی تحریک کے وسیع تناظر کو دیکھتے ہوئے ہی اٹھے تھے جو افسوس کہ بانی تبلیغ، مصلح امت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کے ذہن ہی میں رہا اور ان کی وفات پر ان کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ عالم عربی کے مجدد امام حسن البناؒ کی تحریک اور ان کا منہج عمل اپنے جلال و جمال میں اسی تحریک کا پرتو نظر آیا اور مولانا نے اس سے فیض اٹھانے میں کمی نہیں کی۔ غرض یہ کہ ان کا اصل مایہ خمیر تحریک شہیدین تھی، اسی مشن کو انھوں نے اپنا مشن بنایا اور تاحیات اس مشن کے وفادار رہے، اور خود ان کا وجود مسعود بھی اس تحریک کا معنوی و امتداد و تسلسل بن گیا۔

مولانا ندویؒ کا بنیادی وصف یہ تھا کہ وہ عالم اسلام میں منصب توجیہ و تشریح پر فائز تھے۔ عصر حاضر میں دین کی نئی تعبیر و تشریح کا مسئلہ پیش آیا اور بعض مفکرین سے اس سلسلہ میں بعض تسامحات ہونے لگے تو مولانا نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اس ضمن میں اپنے بعض محبوب رفقا اور دوستوں پر بھی علمی تنقید و محاسبہ کا فرض انجام دیا اور عصر حاضر میں دین کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں مولانا مودودیؒ کی تعبیری فروگزاشتوں کا بھی مواخذہ کیا۔ اربید ان اتحاد السی الاخوان اور کتاب ”البصائر“، ”عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح“ اور ”ترشید الصحوة الاسلامیة سب اس تشیدی و توجیہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جب برصغیر کے ایک تحریکی حلقہ میں یہ مسئلہ بڑے شد و مد کے ساتھ اٹھایا گیا کہ قرآن کے مخصوص مصطلحات کے معنی و مفہوم پر صدیوں پردہ پڑا رہ گیا تھا تو مولانا نے اس بات کی شدت کے ساتھ تردید کی اور علمی اور مثبت انداز میں ”دعوت و عزیمت“ کا ایک تاریخی سلسلہ لکھا۔ یہ پورا سیٹ اصلاً ان کے اس دعوے کا علمی ثبوت تھا کہ امت میں اصلاح و تجدید کا ایک تاریخی تسلسل قائم رہا ہے اور کسی مرحلہ میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ دین کے مجموعی مفہیم امت سے مستور ہو گئے ہوں۔ ماذا خسّر العالم بانحطاط المسلمین اور ”الصراع بین الفکرۃ الغربیة و الفکرۃ الاسلامیة“ میں انھوں نے مختلف اسلامی ممالک میں امت کے ماضی حال و مستقبل کا ایک بصیرت افروز اور مؤرخانہ و ناقدانہ جائزہ لیا، زوال و ادبار کے عوامل کی نشاندہی بھی کی اور موجودہ حالات میں عالم اسلام کس راستہ کو اختیار کرے، اس سوال کا جواب دیا اور واضح منہج عمل مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ عالم اسلام نے مولانا کی اس توجیہ و ترشید کو دل سے قبول کیا ہے، چنانچہ تحریکات اسلامیہ کے موجودہ منہاج عمل اور عملی طریقہ ہائے کار میں اس کے اثرات کو صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لحاظ سے مولانا اس صدی کے بہت بڑے فکری قائد اور روحانی مرشد ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا دوسرا بڑا وصف یہ ہے کہ وہ فقہی توسع کے قائل اور اس کے علمبردار تھے۔ انھوں نے جمود و تقلید کے بجائے ہمیشہ اجتہاد کی دعوت دی۔ عشق رسول، اتباع سنت، اور احترام سلف کے ساتھ تربیت باطن اور تزکیہ و احسان کو

_____ ماہنامہ الشریعہ (۸) اپریل ۲۰۱۰ _____

مطلوب شرعی قرار دیتے رہے۔ انھوں نے تصوف کو بدعات و خرافات اور عجی اثرات سے پاک کرنے کی دعوت دی اور کتاب و سنت پر مبنی تصوف (احسان) کو روح دین سے کبھی متضاد نہیں سمجھا بلکہ اگر دیکھا جائے تو صحیح معنی میں انھوں نے ہی برصغیر میں پہلی بار علم تزکیہ (تصوف) کی تجدید کی اور اسے بدعات و شرکیہ اعمال سے اس کی تطہیر کی بنا رکھی۔ اسی سلسلہ میں ان کے گہر بار قلم سے ربانیت لا رہبانیت نکلی۔ انھوں نے پوری ملت کو اپنا مخاطب سمجھا اور بنایا۔ جماعت دیوبند سے بھی انھیں ویسی ہی محبت تھی جیسی تحریک ندوہ سے۔ محدثین کے مسلک سے بھی انھیں عقیدت تھی اور قبیح سنت صوفیا اور سلاسل تصوف کے بھی وہ قدردان تھے۔ گویا ان کی ذات میں تحریک ندوہ کی بازیافت ہوئی تھی اور اس کی اصل روح عود کر آئی تھی۔ المیہ یہ ہے کہ مولانا کے اس فکری اور عملی توسع کو بعض خوردہ ہیں اور کوتاہ چشم فکر و عمل کا تضاد سمجھتے ہیں۔

مولانا ندویؒ نے دین کی سیاسی تعبیر پر تنقید کی، تاہم وہ اپنی زندگی کے کسی لمحہ میں بھی دین و سیاست کی دوئی اور تفریق کے قائل نہیں رہے۔ انھوں نے اسلام کی شوکت، خلافت کے ادارہ کے احیاء اور عالم اسلام کے اتحاد اور قوت کی آرزو کی، اس کے لیے کوششیں کیں اور عالم اسلام کے سربراہوں، امراء، مفکروں اور دانشوروں سے جماعتوں اور ان کے قائدین سے اس سلسلہ میں کھلی باتیں کیں۔ ان کا سلسلہ ”السعیمیات“ اس پر شاہد عدل ہے۔ انھوں نے عالم اسلام کے مسائل سے ہمیشہ تعلق رکھا، مسلمان امرا کو ان کے فرائض سے متعلق آگاہ کرتے رہے، انھوں نے مصر کی ناصریت، عربی قومیت اور ترکی کی کمالیت پر تنقید کی، مسجد اقصیٰ اور مقبوضہ فلسطین کے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

امت کے ضیاع پر مولانا ابوالحسن علی ندوی (جو عرف عام میں علی میاں ندوی کے نام سے معروف ہیں) انگاروں پر لوٹتے تھے، لیکن ان کا یہ درجہ محض احساس و شعور اور قسط و قلم تک ہی محدود نہ تھا، انھوں نے امت کا مرثیہ پڑھنے اور آہ و بکا کرنے پر بھی اکتفا نہیں کیا۔ وہ قنوطیت اور یاسیت کے بھی شکار نہ تھے نہ ہی خوش فہمیوں میں مبتلا رہے، بلکہ میدان عمل میں آکر ایک دیدہ و رسا ہی کی طرح اور ایک باشعور اور با بصیرت قائد کی طرح ہر محاذ پر آگے نظر آئے۔ وہ ڈرائنگ روم مفکروں، گوشہ نشین علماء و مدرسین اور زمانے کے اندھیروں اور اجالوں سے بے خبر ”ہو حق“ کی ضربیں لگانے والے عابدوں اور زاہدوں میں سے نہیں تھے بلکہ ان کی پوری زندگی تمام تر علمی و تحقیقی مشغولیتوں، عبادات کے ذوق و شوق اور روحانی ریاضتوں کے باوجود سر تا پا جہد و عمل سے عبارت تھی۔ وہ عالم اسلام میں ہونے والے ہر قسم کے تعلیمی و تربیتی، دعوتی اور اصلاحی کاموں میں تعاون کرتے اور اصلاحی تحریکات کے پشت پناہ اور مؤید اور ان کے لیے دعا گو بھی تھے۔

مولانا ندویؒ کو فکر و ارجمند کے ساتھ دل درد مند بھی عطا ہوا تھا۔ دین ظلم سے، کفر اور شرک سے نفرت سکھاتا ہے، لیکن ایک انسان کے ساتھ (چاہے وہ کافر و مشرک ہی کیوں نہ ہو) وہ فرخ دلا نہ، مصلحانہ اور ناصحانہ رویہ کا طالب ہے۔ ہر نبی کی دعوت میں یہ چیز نہایت ابھری ہوئی ہے کہ ہر نبی نے اس راہ کی تمام مشکلات کو خندہ جمینی سے برداشت کیا اور قوم کی طرف سے پیش آنے والی مصیبتوں اور اذیتوں کے باوجود انسا لکم ناصح امین ہی کہا۔ علماء حق اور مصلحین امت بھی انبیاء کی نیابت کرتے ہیں۔ بنی آدم کے لیے ہمدردی و غم گساری، بلند انسانی قدروں کی حفاظت، حق کی طرف داری، مظلوموں کے حق میں آواز اٹھانا، اور ظلم کے خلاف احتجاج کرنا وغیرہ جیسے عناصر کا پایا جانا دعوت و اصلاح کی تاریخ کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ مولانا کی ”پیام انسانیت“ کی تحریک دراصل ایسی جذبہ و احساس کی ایک تعبیر ہے۔

آج عقلیت کا دور دورہ ہے۔ سائنٹفک ریسرچ و تحقیق کے نام پر الحادی تہذیب اور تشکیک کی فضا پھیلانی جا رہی ہے۔ اس صورت حال میں دینی مفاہیم اور تعلیمات کی تشریح کے لیے عصری اسلوب کا استعمال وقت کا تقاضا اور ایک ناگزیر دعوتی

_____ ماہنامہ الشریعہ (۹) اپریل ۲۰۱۰ _____

ضرورت ہے۔ اس صدی کے کئی بہترین دماغوں نے عقلی اور استدلالی اسلحوں سے لیس ہو کر اسلام کی نصرت و اشاعت کا کام کیا ہے جس کی مثال میں مولانا وحید الدین خان کی شاہکار کتاب ”مذہب اور علم جدید کا چیلنج“ کو پیش کیا جاسکتا ہے اور ان کا یہ کام اپنی جگہ نہایت متم با نشان اور ضروری ہے اور مولانا ندوی عصری اسلوب میں کام کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ تاہم یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان عقل و منطق کے سہارے زندگی نہیں گزار سکتا۔ عقل اور سائنس انسان کے دل میں شکوک و شبہات کے بیج بوسکتے ہیں، اسے ایمان و یقین کی حرارت اور طمانیت قلب کی دولت نہیں دے سکتے۔ یہ چیز تو اسے صرف قلب و روح کی تسکین اور جذبہ و ضمیر کے اطمینان کے راستے سے مل سکتی ہے۔ مولانا کا یہ ایک بہت بڑا امتیاز ہے کہ وہ عقل سے زیادہ جذبہ کی تطہیر اور فکر سے زیادہ عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ یہی انبیاء و مصلحین کی دعوتوں کا مزاج بھی رہا ہے۔ ایک صحیح حدیث میں اس حقیقت کو ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ ”الا ان فی الجسد لمضغة اذا صلح صلح الجسد کله و اذا فسد فسد الجسد کله، الا وھی القلب“۔

موجودہ زمانہ فن کا زمانہ ہے۔ آج فن سے کام لے کر لوگ اس فکر و خیال کی بھی جاندار و شاندار ترجمانی کر دیتے ہیں جن سے انہیں کوئی قلبی تعلق اور دلی وابستگی نہیں ہوتی۔ غالباً یہ بھی ایک وجہ ہے کہ داعیوں کی کثرت اور مطبوعہ اور مسموعہ لٹریچر کی زیادتی کے باوجود متوقع اثرات و نتائج حاصل نہیں ہو رہے ہیں۔ آج کتنے ہی سحر انگیز خطیب، کتنے ہی وسیع المطالعہ دانشور اور بلیغ طرز ادا کے مالک مصنفین اور جادو نگار ادیب اور محقق مل جائیں گے جن کے فکر و عمل میں واضح تضاد ملتا ہے، جن کے بولنے اور لکھنے پر فدا ہونے والے اور سن کر مسحور ہو جانے والے ان کی سیرت و کردار کو دیکھیں تو یقیناً انہیں ان کی سطح سے بہت گرا خیال کریں اور ان پر نفرتیں بھیجیں لگیں۔ دانشوروں کی اس بھیڑ میں مولانا علی میاں کا ایک امتیاز یہ ہے کہ ان کے ہاں دانش و نیش بھی ہے اور ایمان ایقان کی سرور آگیاں کیفیت بھی۔ ان کے حرف حرف سے اخلاص و ولایت ٹپکی پڑتی ہے۔ ان کی پر شکوہ اور خطیبانہ طرز کی تحریروں و تقریروں میں فصاحت و بلاغت کی چاشنی بھی ہے، حرارت قلب اور جوش عشق کا سامان بھی۔ کثرت معلومات اور تحقیق کے اعلیٰ درجہ پر ہوتے ہوئے بھی ان کے بول بول میں ایک عجیب طرح کی روحانی کشش و لذت پائی جاتی ہے۔ ان کا قاری انہیں پڑھ کر جوش عمل سے سرشار ہو جاتا ہے اور اسے کہیں بھی قول و فعل میں تضاد یا دورگی کا احساس نہیں ہوتا اور مصنوعیت اور لفاظی کا خیال نہیں ہوتا۔

مولانا علی میاں کے ہاں فن بھی ہے اور فنی نزاکتوں کا بھرپور احساس بھی، تاہم فن سے زیادہ مقصدیت ان کے پیش نظر ہوتی ہے۔ وہ ادب برائے ادب کی تخلیق نہیں کرتے بلکہ ادب کو ایک اعلیٰ اور بلند انسانی زندگی کی تعمیر کے لیے استعمال کرتے ہیں اور عالمی رابطہ ادب اسلامی ھ۔ دراصل ان کے اسی ادبی فکر کا عملی مظاہرہ ہے۔ کوئی شک نہیں کہ وہ اردو و عربی دونوں کے ایک صاحب طرز انشا پرداز ادیب ہیں، اسی طرح وہ ایک کامیاب سوانح نگار، اور صاحب نظر ناقد و مؤرخ ہیں، لیکن اس سب سے زیادہ وہ ایک دل دردمند رکھنے والے داعی، دیدہ و رسّاح اور صاحب فراست مربی ہیں۔

حواشی

۱۔ مولانا مودودی اور سید قطب کی تحریروں میں دین کے سیاسی پہلو پر غیر ضروری زور دیا گیا اور ان کی تشریح کی رو سے دین کی سماجی و اجتماعی نظام زندگی کی حیثیت زیادہ ابھر کر سامنے آئی اور اس کا تعبدی پہلو کمزور پڑ گیا جس کے اثرات ان کے پیدا کردہ لٹریچر میں بھی صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔ مولانا مودودی کا یہ فکر تفہیم القرآن، اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر، اور خطبات میں نظر

آتا ہے، تاہم اس کو خاص منضبط انداز میں انہوں نے قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں میں پیش کیا ہے جس میں انہوں نے اللہ، رب، عبادت اور دین کے معانی و مفہیم لغت عرب کی بنیاد پر متعین کیے ہیں، ان کے مطابق صفات الہیہ میں حاکمیت اللہ اور اقتدار اعلیٰ ہی اصل اور بنیادی صفت ہے۔ اس فکر پر مفصل نقد کے لیے ملاحظہ ہو ”تعبیر کی غلطی“، مؤلفہ مولانا وحید الدین خان اور ”عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح پر ایک نظر“ از مولانا ابوالحسن علی ندوی۔

۲۔ سید قطب نے بھی معالم فی الطريق اور فی ظلال القرآن میں متعدد مقامات پر اس فکر کی ہم نوائی کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ
 اخص خصائص الالوهية الحاکمية۔

۳۔ اصل میں دین کی عصری تعبیر ایک دودھاری تلوار کی طرح ہے جس میں اگر ذرا سا بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے اور حد سے تجاوز ہو جائے تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ عنایت اللہ مشرقی جیسے عبقری اور ذہین انسان نے جب ٹھوکر کھائی تو خاکسار تحریک چلائی اور دین کی عصری تعبیر کے نام پر علما کی شدید و بے جا مخالفت شروع کر دی۔ عبادات کے نظام اور قرآن کی ترتیب اور نظم کی تفہیم میں من مانی تاویلات کیں، نماز کو فوجی پریڈ بنادیا۔ علما سے سائنس داں مراد لیے۔ مشرقی صاحب کی یہی تاویلات ان کی کتاب تذکرہ میں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ اس کتاب اور اس کے نکتہ میں انہوں نے قرآن کی نزولی ترتیب وضع کی ہے، اور اسی کو اصل قرار دیا ہے، نیز علما کی مخالفت میں ”ملا کا نیا دین“ ۱-۲-۳ نہایت استہزائیہ انداز میں لکھی۔ اسی طرح غلام احمد پرویز نے دین کی معاشی اور سوشلسٹ تعبیر کی اور زکوٰۃ کا پورا سسٹم انہیں ذاتی ملکیت کے خلاف نظر آیا جیسا کہ ان کی کتاب ”لغات القرآن“ اور ”نظام ربوبیت“ سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کے ہاں انکار حدیث کا رجحان اس پر مستزاد ہے۔

۴۔ یہ نقطہ نظر اصلاً صوفیا کا تھا جن کے ہاں مخاطب کی رعایت، انسان دوستی و خدمت خلق کے فلسفہ کے باعث کفر و اسلام کے مابین امتیاز بھی ختم سا ہو گیا تھا۔ بعض اوقات انہوں نے مقامی تصورات و رسوم کو بھی وسیلہ تبلیغ کے طور پر اختیار کر لیا۔ بلاشبہ محقق صوفیا ہمیشہ ان غالی خیالات کی تردید کرتے رہے، لیکن ان کے اکثر طبقات و سلاسل پر یہی رجحانات غالب رہے جس میں وحدت الوجود کے فلسفہ نے توحید و شرک کے مابین سارے فاصلے ہی ختم کر دیے۔ دور جدید میں تصوف کے زیر اثر حلقوں میں ایک اور فلسفہ نمودار ہوا جس کی ترجمانی برصغیر میں تبلیغی جماعت کا پیٹرن کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان عوام پر اصلاح و تبلیغ کے اس فکر کے گہرے اثرات پڑے ہیں، تاہم اس کا یہ پہلو بہت کھٹکتا ہے کہ اس میں بھی عن المنکر کے پہلو کو مکمل طور پر فراموش کر کے امر بالمعروف اور بشارت کے پہلو پر زور صرف کیا جاتا ہے اور احادیث فضائل سے خاص طور پر مدد لی جاتی ہے۔

۵۔ ملاحظہ ہو عصر حاضر میں دین کی تشریح و تفہیم پر ایک نظر۔

۶۔ یہ خیال مولانا مودودی نے اپنی کتاب ”قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں“ کے مقدمہ میں (ص ۶۲۴) میں ظاہر کیا ہے۔
 ۷۔ مصر میں ناصری مظالم کی شدت کے وقت جیلوں میں بند چند اخوانی نوجوانوں میں رد عمل کی کیفیت پیدا ہوئی اور انہوں نے صدر ناصر اور اس کے حواری موار یوں کی تکفیر شروع کر دی تو اس شدت کے خلاف اخوان کے مرشد عام استاذ حسن البغیبی نے ایک کتاب لکھی ”دعاة لا قضاة“ کہ ہم داعی ہیں، خدائی فوجدار نہیں۔ یہ کتاب گویا مولانا علی میاں کے خیالات کی تائید ہی تھی۔